مولانا ابوالکلام آزاد

اکبر اعظم اور مسیحی حرم

ایک انگریز پروفیسر کی تاریخ دانی

آج کل سینٹ زیویر کالج[12] کلکتہ کے فادر ہوسٹن[13] کی ایک نئی تاریخی تحقیقات کا انگریزی اخبارات و رسائل میں بہت چرچا ہے، جس کی نسبت وہ اپنی تحریر ایشیاٹک سوسائٹی[14] کلکتہ کے آئندہ ماہواری جلسے میں پڑھیں گے۔ حال میں اس کی نسبت مسٹر ایم۔ اے۔ ایف نے اخبار " انگلش مین" کلکتہ میں ایک تحریر شائع کی ہے اور اس کی تائید و توثیق کی کوشش کی ہے۔ اس نام نہاد تاریخی انکشاف کا خلاصہ یہ ہے کہ " شہنشاہ اکبر کی جس ملکہ کا نام مریم مکانی یا مریم زمانی تھا وہ دراصل ایک مسیحی ارمنی لیڈی تھی۔"

اب اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز جو سامنے آتی ہے، وہ اس نام نہاد انکشاف کی طرفہ نمائش ہے۔ فادر ہوسٹن اور مراسلہ نویس " انگلش مین" کا خیال ہے کہ یہ انکشاف مسلمانوں کے لیے خاص طور پر مؤثر و دلچسپ ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان دو نئے مورخوں کی معلومات جس قدر تاریخ ہند کے متعلق ہے (جیسا کہ تھوڑی دیر میں آپ پر واضح ہو جائے گا) اس سے زیادہ مسلمانوں کے جذبات و محسوسات کے متعلق نہیں ہے۔ فادر موصوف کو شاید معلوم نہیں کہ مسلمانوں کی ملکی فتوحات کی طرح ان کے معاشرتی و منزلی فتوحات کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ ان کے لیے یہ بالکل ایک معمولی خبر ہوگی، اگر

ثابت ہو جائے کہ کسی مسلمان نے کسی مسیحی خاتون کو اپنے حرم میں داخل کر لیا تھا، جب کہ یہ معلوم ہے کہ اکبر کے محل میں ہندو رانیاں موجود تھیں اور خود ولی عہد سلطنت کی ماں ہندو تھی اور جب کہ اکبر کے بعد تمام شاہان مغلیہ محبت پرست ہندو راجوں سے ایسے رشتے کرتے رہے تو پھر اس خبر میں کون سی نُدرت و غرابت ہو سکتی ہے ؟ جہاں ہندو رانیاں محل اکبری کی زیب و زینت تھیں، وہاں ایک مسیحی خاتون کو بھی یہ شرف مل گیا۔ علی الخصوص ایسی حالت میں جب کہ اسلام نے اہلِ کتاب سے ایسے رشتوں کی اجازت دے دی ہے اور ہر زمانے میں ایسے مسلمان رہے ہیں جنھوں نے اس اجازت سے فائدہ اُٹھایا ہے۔

پس یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کو سُن کر مسلمان چونک اُٹھیں۔ البتہ اصلی سوال تاریخی حیثیت سے ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی اکبر کے محل میں مریم مکانی یا مریم زمانی نامی ایک مسیحی عورت موجود تھی ؟

فادر موصوف اپنی نئی تحقیقات کا جو کچھ سرمایہ ایشیاٹک سوسائٹی کے جلسے میں پیش کریں گے ۱۵ میں بغیر اس کے انتظار کے یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ مریم مکانی یا مریم زمانی کا مسیحی ہونا ایک طرف رہا، اس نام کی کسی عورت کا پورے عہدِ اکبری میں کوئی وجود ہی ثابت نہیں ہوتا۔ فادر ہوسٹن مریم مکانی یا مریم زمانی کی مسیحیت اور ارمنیت کی تھیوری کی طیاری کو براہِ عنایت سرِ دست ملتوی کر دیں۔ پہلے وہ یہ ثابت کریں کہ محل اکبری میں اس نام کی کسی ملکہ کا وجود بھی تھا ؟

دہن کا ذکر کیا ، یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

اس نام نہاد انکشاف کی بنیاد اس پر ہے کہ اکبر کی بیویوں میں سے ایک محل کا نام "مریم" تھا اور وہ مریم مکانی یا مریم زمانی کے نام سے مشہور تھی، چونکہ مریم (میری) ایسا نام ہے جو مسیحی عورتوں کا بھی ہوتا ہے، اس لیے فوراً یہ قیاس کر لیا گیا کہ وہ مسیحی ہو گی اور پھر اس پر ایک پوری عمارت تیار کر لی گئی، لیکن لطف یہ ہے کہ حرم سرائے اکبری میں اس نام کی کوئی عورت تھی ہی نہیں، اور اس لیے اس دعوے کی اولین بنیاد ہی ثبوت طلب ہے۔

اصل یہ ہے کہ جہالت اور ناواقفیت کی وجہ سے فادر ہوسٹن اور ان سے پہلے بعض یورپین سیاحوں نے سخت غلطی یہ کی ہے کہ خطاب کو نام سمجھ لیا ہے۔ اتنی معمولی سی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی ہے کہ مسلمان حکمران خاندانوں میں مردوں کی طرح اعلیٰ درجہ کی شاہی خواتین کے خطابات بھی ہوتے تھے اور نام کی جگہ وہ عموماً انہی خطابوں سے پکاری جاتی تھیں۔ "مریم مکانی" کے خطاب سے اکبر کی کوئی بیوی تو نہیں پکاری گئی، البتہ اکبر کی ماں حمیدہ بانو بیگم کا خطاب مریم مکانی ضرور تھا اور اکبر اور تمام ملک اسی خطاب سے اس کو یاد کرتا تھا۔ اسی طرح سلطان سلیمہ بیگم کا خطاب خدیجۃ الزمانی تھا، نہ کہ مریم زمانی، اور یہ بلاشبہ ہمایوں کی بھانجی اور اکبر کی بیوی تھی۔

پس اوّل تو مریم نام کسی ملکہ کا نہ تھا، اور پھر اگر مریم مکانی کے نام سے پکاری بھی گئی، تو ہمایوں کی بیوی حمیدہ بانو، نہ کہ اکبر کی بیوی۔ اور شاید ہمارے نئے مقدس محقق کو یہ بتلانا ضروری نہ ہوگا کہ ہمایوں اکبر کا باپ تھا نہ کہ اکبر ہمایوں کا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اکبر کو ایک مسیحی لیڈی کا شوہر ثابت کرنے کی عظیم الشان تاریخی تحقیق کی جگہ اگر فادر موصوف پہلے اس مسئلے کی طرف متوجہ ہوتے تو بہت زیادہ موزوں ہوتا کہ ہمایوں اکبر کا باپ تھا یا اکبر ہمایوں کا؟ یقیناً یہ ایک ایسی تاریخی گرج ہوتی جس سے نہ صرف مسلمان بلکہ تمام دُنیا چونک اُٹھتی۔

اس موقعے پر بے اختیار بحث کا یہ درد انگیز پہلو سامنے آجاتا ہے کہ یورپ اور علی الخصوص انگلستان باوجود حکمرانی کے ہماری تاریخ، ہمارے علوم اور ہمارے حالات سے کس درجے بے خبر ہے۔ انگلستان ایک صدی سے ہندوستان پر حکمران ہے۔ نئے وسائلِ آمد و رفت، تجارتی و سیاسی علائق کی وسعت، مشرقی اقوام کی عالمگیر محکومیت، اور مشرقی السنہ و علوم کی واقفیت و تحقیقات نے یورپ اور مشرق کو ایک کر دیا ہے۔ صدہا کتابیں مشرقی علوم و مسائل پر لکھی گئی ہیں۔ بے شمار سوسائٹیاں محض مشرقی علوم و تاریخ کے درس و مطالعے کے لیے قائم ہیں۔ علی الخصوص ہندوستان کی تاریخ دانی کی صف میں انگریز مصنفین کی ایک بہت بڑی جماعت واقفیت کے ادّعا اور تبحّر کے گھمنڈ کے ساتھ

اپنے تئیں نمایاں کرتی ہے اور روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ خاص شہنشاہ اکبر کے متعلق (بقول ڈاکٹر اسپرنگر[۱۶] جو اب سے تیس سال پہلے تھے) سو سے زیادہ کتابیں انگریزی میں لکھی جا چکی ہیں۔ "آئینِ اکبری" اور "تزکِ جہانگیری" کا پورا ترجمہ فرنچ اور انگریزی دونوں میں ہو چکا ہے[۱۷] "اکبر نامہ" کا خلاصہ تین شخص چھاپ چکے ہیں[۱۸] "طبقاتِ اکبری"، بدایونی اور فرشتہ کے خلاصے ایشیاٹک سوسائٹی کا جرنل شائع کر چکا ہے[۱۹] با ایں ہمہ اس قوم کے علما و مورخین کی تاریخ دانی کا یہ حال ہے کہ آج ہندوستان کے سب سے بڑے نامور اور بہترین کالج (سینٹ زیور) کے ایک معلم اور اس کے حامیوں کو یہ تک نہیں معلوم کہ مریم مکانی اور مریم زمانی نام نہیں بلکہ خطاب ہے اور مریم مکانی اکبر کی ماں تھی نہ کہ بیوی۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

مشرقی بادشاہ اور ان کے امرا و حکام عموماً خطابوں سے مشہور ہوتے ہیں اور خاندانِ مغلیہ میں تو نام صرف اس وقت تک رہتا تھا، جب تک کوئی منصب نہیں ملتا تھا۔ منصب کے ساتھ ہی خطاب بھی ملتا تھا اور ابتدائی و اوسط درجے کے خطاب عموماً ایسے ہوتے تھے، جو مثل عَلَم (نام) کے معلوم ہوتے تھے۔ نقیب خاں، بہادر خاں، غازی خاں، دانشمند خاں، آصف خاں، اعظم خاں، مظفر خاں، قطب الدین خاں وغیرہ وغیرہ خطاب ہیں، نام نہیں ہیں۔ آصف خاں کا نام خواجہ عبدالمجید تھا۔ مگر خطاب سے مشہور ہوئے۔ میر عبداللطیف قزوینی کو اکبر نے نقیب خاں کا خطاب دیا اور کہا کہ کتابیں پڑھ کر سنایا کرو۔

جہانگیر نے جب عہدِ اکبری میں بغاوت کی تو اپنے شیخ جیون کو قطب الدین خاں کا خطاب دیا اور بہار کا گورنر مقرر کیا۔ اب اگر کوئی ان لوگوں کے خطابوں کو نام قرار دے کر بنیادِ بحث قرار دے، مثلاً کہے کہ نقیب خاں کا نام "نقیب" اس لیے تھا کہ وہ اصلاً عرب تھے اور عرب کے خاندان نقابت سے تعلق رکھتے تھے اور قطب الدین خاں کا نام باپ نے قطب الدین اس لیے رکھا کہ ان کے مورث اعلیٰ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ہیں تو گو یہ تاریخی تحقیقات ایشیاٹک سوسائٹی کے کوارٹرلی جرنل کے لیے ایک عمدہ ذخیرہ ثابت ہو مگر دنیا

کے لیے بجز اس کے اور کیا ہوگا کہ تاریخ کے بیدردانہ قتل پر رائے اور تحقیق کی موت پر مرثیہ خوانی کرے۔

جس طرح امرا و رؤسا عموماً خطابوں سے پکارے جاتے تھے، اسی طرح محل شاہی کی معزز خواتین کے نام بھی خطابوں کی شہرت میں معدوم ہو جاتے تھے۔ مریم مکانی کا نام حمیدہ بانو بیگم تھا۔ اکبر کی پھوپھی گلبدن بیگم نہایت قابل اور اہلِ قلم تھی۔ اس نے اکبر کی فرمائش سے ہمایوں کے حالات میں "ہمایوں نامہ" لکھا۔ اس کے ابتدائی اجزا نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر سے مسٹر ایلیٹ کو مل گئے تھے۔ اس کا ترجمہ اُنھوں نے اپنے منتخبات تاریخ میں شامل کر دیا ہے اور اب اصل بھی مع ترجمے کے چھپ گئی ہے[۲۰]۔ گلبدن بیگم نے نہایت تفصیل سے حمیدہ بانو کا حال لکھا ہے۔ کاش فادر ہوسٹن اور مراسلہ نویس "انگلش مین" مسٹر ایلیٹ کی تاریخ ہی پر نظر ڈال لیتے۔ گلبدن بیگم لکھتی ہیں کہ جن دنوں شیر شاہ کی چیرہ دستیوں سے ہمایوں حیران و سرگرداں پھر رہا تھا، ایک دن اس کی والدہ نے ضیافت کا سامان کیا۔ وہاں ایک نوجوان لڑکی نظر آئی اور ہمایوں کو توجہ خاص ہوئی۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ہمایوں کے بھائی مرزا ہندال کے استاد کی لڑکی ہے اور شیخ احمد جام زندہ پیل کی اولاد میں سے ہے۔ حمیدہ بانو نام ہے۔ ہمایوں کا دل آ گیا تھا اور سفر غربت و بداقبالی میں جہاں کہیں گیا اپنے ساتھ رکھا۔ جودھپور سے پلٹ کر جب سندھ کی طرف آیا تو عمر کوٹ میں اکبر پیدا ہوا۔

میری تمام کتابیں کلکتہ میں ہیں۔ یہاں کوئی تاریخ ساتھ نہیں لیکن مجھ کو معلوم ہے تمام مورخین ہند مثلاً اکبر نامہ، طبقاتِ اکبری، بدایونی، خافی خاں وغیرہ سب نے مریم مکانی کا یہ حال لکھا ہے۔ خصوصاً ابوالفضل کے بعد اور کسی شہادت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور یہ واقعہ اس درجہ مسلّم اور معروف ہے کہ اس کے لیے ثبوت بہم پہونچاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اکبر نامہ، بدایونی اور خافی خان[۲۱] کو ایشیاٹک سوسائٹی نے چھاپا ہے اور فادر ہوسٹن جس ہال میں اپنا مضمون پڑھیں گے، اس کے پہلو کے کمرے میں یہ کتابیں موجود ہیں۔

ہمایوں نے جب انتقال کیا اور اکبر تخت نشین ہوا تو اپنی والدہ کو مریم مکانی کے لقب سے پکارنے لگا۔ غالباً ملا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ یہ لقب بیرم خاں کے اختراعات سے تھا۔ اکبر اپنی ماں کا عاشق تھا اور بے حد عزت و احترام کرتا تھا۔ محل میں اس کے آگے ماہم کی بھی نہیں چلتی تھی اور جس طرح خاندانِ عثمانیہ میں "والدہ سلطان" حرم سرا کی شہنشاہ ہوتی ہے، اس طرح حرم اکبری میں مریم مکانی سر بلند تھی۔ وہ جب تک زندہ رہی، اکبر مہماتِ سلطنت میں بھی اس کے حکم کے آگے جھکتا رہا۔ "اکبر نامہ" میں بار بار مریم مکانی کا ذکر آتا ہے۔ کبھی کسی شہزادے کی سفارش کی ہے، کبھی کسی مجرم کو بخشوا دیا ہے، کبھی کسی بگڑے شہزادے کی تالیفِ قلب کے لیے جا رہی ہے۔ بڑے بڑے تفریحی سفروں میں بھی مریم مکانی کی سواری تزک و احتشام سے ساتھ رہتی تھی۔ اکبر نے جب کشمیر کا آخری سفر کیا ہے تو تمام بیگمات کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ ابوالفضل نے "اکبر نامہ" میں لکھا ہے کہ سرینگر پہنچ کر خیال ہوا کہ کیا اچھا ہو اگر مریم مکانی کے قدم سے بھی یہ گلگشت برکت پائے۔ مجھ کو حکم ہوا کہ عریضہ لکھو۔ پھر فرمایا کہ پیشانی پر یہ شعر لکھا جائے کہ غالباً خود اکبر کا ہے:

حاجی بسوئے کعبہ رود از برائے حج　　　یارب بود کہ کعبہ بیاید بسوئے ما

ملا عبدالقادر نے لکھا ہے کہ جب مریم مکانی کا انتقال ہوا تو ہندوؤں کی رسم کے مطابق اکبر نے بھدرا کیا۔ چودہ پندرہ سو آدمیوں نے اس کی تقلید کی اور چار ابرو کا صفایا کر دیا۔ یہ اکبر کا پہلا بھدرا تھا۔ دوسری مرتبہ انکہ (اناّ) کے مرنے پر بھدرا کیا اور گو درباریوں کو روکا مگر چار سو چہرے صاف ہو چکے تھے۔

میرے پاس اس وقت کوئی تاریخ نہیں ہے کہ ٹھیک سے سن وفات بتلا سکوں۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ جس سال سلیم (جہانگیر) نے دوبارہ بغاوت کی ہے اور ابوالفضل دکن سے آتے ہوئے قتل ہوا ہے، اسی سال مریم مکانی نے انتقال کیا۔ کیونکہ خافی خاں نے لکھا ہے کہ اکبر سلیم کو سمجھانے کے لیے خود جانا چاہتا تھا کہ مریم مکانی کے انتقال کی خبر آگئی اور سفر رک گیا۔ ابوالفضل کی شہادت کی تاریخ کو کلتاش نے کہی تھی اور اپنے دل کا بخار نکالا تھا۔

یتیغ اعجاز نبی اللہ سر باغی بُرید

"باغی" سے ب نکال دیا تو باقی کے علد ایک ہزار گیارہ ہوتے۔ پس مریم مکانی کے انتقال کا سن بھی یہی سمجھنا چاہیے۔ اکبر نے نعش دہلی بھیجی اور مقبرہ ہمایوں میں دفن کی گئی۔

اب دیکھیے کہ اسی مریم مکانی کے انتقال کے متعلق مراسلہ نگار" انگلش مین" اور ان کے بعض پیشروؤں کو کیسے کیسے دھوکے ہوتے ہیں اور کیسی کیسی ٹھوکریں کھائی ہیں؟ مسٹر ایم۔ اے۔ الیف لکھتے ہیں :

" اکبر کی ایک عیسائی بیوی تھی اور اس کا نام مریم تھا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جسے قطعی کہنا بےجا نہ ہوگا۔ ڈی لائٹ اپنی کتاب ایمپائر آف دی گریٹ مغلز میں جو اکبر سے ۲۶ برس بعد لکھی گئی ہے، لکھتا ہے کہ محل شاہی میں چند کمرے میری میکانی کے لیے وقف تھے جو اکبر کی بیوی تھی۔"

اوّل تو یہی یکسر غلط ہے کہ اکبر کی کسی بیوی کا نام مریم تھا، جیسا کہ اوپر گزر چکا۔ ثانیاً ڈی لائٹ[۲۲] کی جس روایت کو نقل کیا گیا ہے، وہ خود چند در چند غلطیوں کا تمسخر انگیز مجموعہ ہے۔ ظلمات بعضها فوق بعض! جس بیگم کو اس نے "میری میکانی" لکھا ہے وہ دراصل مریم مکانی ہے۔ مریم کی جگہ میری بالکل ٹھیک، مگر مکانی کا تلفظ ایک یورپین سیاح قدرتی طور پر صحیح نہیں کر سکتا تھا، اس لیے مکانی کو اس نے اپنے لہجے میں میکانی لکھ دیا۔ میکانی ایک ایسا لفظ ہے جس پر یورپین نام ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ ہمارے نئے محقق نے سمجھ لیا کہ "میری میکانی" ایک یورپین لڑکی ہے۔ لڑکی کا نام میری ہوگا اور باپ کا نام میکانا۔

(۲)

ڈی لائٹ کا یہ کہنا کہ محل شاہی میں چند کمرے میری میکانی کے لیے مخصوص تھے، بالکل ٹھیک ہے۔ مریم مکانی کا کارخانہ سب سے الگ تھا۔ سفر میں بھی اس کی سواری الگ اور نمایاں ہوتی تھی، لیکن آخر میں اس کی یہ روایت کہ " وہ اکبر کی بیوی تھی" (بشرطیکہ ڈی لائٹ نے یہ لکھا ہو اور ہمارے نئے مورخ دوست کی زیادہ مفسرہ نہ ہو) یقیناً اس کی ذاتی

رائے اور اجتہاد ہے ۔ ایک یورپین سیاح کی نظر میں حرم سرائے شاہی کے اندر بجز بادشاہ کی بیویوں اور حرموں کے اور کچھ نہیں ہوتا ۔ بار بار مریم مکانی، بیگم مریم، مکانی بیگم سنتا ہوگا ۔ غریب نے سمجھ لیا کہ یہ شہنشاہ کی کوئی بڑی ہی معزز بیوی ہے ۔ جب برنیر برسوں رہ کر بھی یہ معلوم نہ کر سکا کہ شاہجہان کی بیوی کون ہے اور بہن کون ہے؟ تو پھر ڈی لائٹ کے متعلق مزید بحث کی ضرورت نہیں ۔ علی الخصوص جب کہ وہ کوئی حوالہ بھی اپنی روایت کے لیے پیش نہیں کرتا ۔

مریم مکانی کے بعد ہمارے مقدس محقق مریم زمانی کا نام لیتے ہیں ۔ اس لیے کہ بنیاد اس دعوے کی تمام تر لفظ مریم پر ہے لیکن مسٹر ایم ۔ اے ۔ ایف مراسلہ نگار " انگلش مین " لکھتے ہیں : " بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جہانگیر جودھا بائی کے بطن سے تھا اور اس کو مریم زمانی کہتے تھے ۔ " طبقات اکبری " کی بنا پر میں تسلیم کرتا ہوں کہ جہانگیر جودھا بائی کا ہی بیٹا تھا ، لیکن جودھا بائی مریم زمانی نہیں ہو سکتی ، اس لیے کہ اس کا انتقال اکبر کے حین حیات میں ہوگیا تھا اور مریم زمانی خواہ کوئی ہو اکبر کے بعد زندہ رہی ہے ۔ جہانگیر " رقعات جہانگیری " میں لکھتا ہے کہ جب میں سریر آرائے حکومت تھا تو مریم زمانی نے میری سالگرہ کی تقریب بڑے تزک و احتشام سے اپنے محل میں کی تھی ۔ گمان غالب یہ ہے کہ وہ بیگم سلطان سلیمہ بیگم تھی ۔ "

مسٹر موصوف نے " بعض لوگوں " کی رائے کو نقل کر کے اور اس کا جواب دیتے ہوئے اپنی تاریخ دانی کی جو نمائش کی ہے ، وہ بہت عمدہ ہے اور یقیناً ہم کو خوش ہونا چاہیے کہ ہمارے محقق کا پایہ اُن " بعض لوگوں " سے ضرور ایک درجہ اونچا ہے جو جودھا بائی کو مریم زمانی کا لقب دیتے ہیں ۔ ساتھ ہی مسٹر موصوف نے نہایت عمدگی سے ضمناً یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ ان کو " طبقات اکبری " نامی کتاب کی خبر ہے اور وہ ایک محتاط مؤرخ کی طرح ان باتوں کو تسلیم کرتے ہیں ، جو کسی تاریخ کی " بنا پر " ثابت ہوں ۔ یہ تمام علامتیں ہمارے لیے اُمید افزا تھیں لیکن افسوس ہے کہ چند جملوں کے بعد ہی " رقعات جہانگیری " کے تاریخی حوالے نے پھر اکبر کی مسیحی ملکہ کی طرح ایک نیا سوال ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ۔ اب سب

سے پہلے اس کو طے کرنا چاہیے کہ کیا جہانگیر کی تصنیفات میں سے کوئی کتاب "رقعاتِ جہانگیری" نامی بھی ہے؟

یہ بہت بہتر ہوا کہ "رقعات جہانگیری" کے حوالے ہی پر مسٹر موصوف نے اپنا مضمون ختم کر دیا اور حوالوں کا سلسلہ آگے نہ بڑھا، ورنہ تاریخ ہند کی مصیبتوں کا ماتم بہت طولانی ہو جاتا۔ ہمارے نئے محقق کو معلوم ہونا چاہیے کہ "رقعات جہانگیری" کوئی کتاب نہیں ہے اور جس کتاب کا وہ حوالہ کسی کتاب میں پڑھ کر دے رہے ہیں، وہ "تزک جہانگیری" ہے نہ کہ "رقعاتِ جہانگیری"۔ جہانگیر نے اپنے قلم سے اپنی ڈائری مثل بابر کے لکھی تھی۔ اس کا نام "تزک جہانگیری" ہے اور سر سید احمد خاں مرحوم نے چھاپ دی ہے۔ انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

افسوس کہ "تزک جہانگیری" اس وقت میرے پاس نہیں ہے، کلکتہ میں ہے اور اس لیے اس حوالے کی نسبت کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ مجھ کو یقینی طور پر یاد ہے کہ ابوالفضل، بدایونی، نظام الدین بخشی اور خافی خاں وغیرہ نے سلیمہ سلطان بیگم کا تفصیلی حال لکھا ہے اور اکبر کے حالات میں جا بجا اس کا ذکر آتا ہے۔ اس کا لقب خدیجۃ الزمانی تھا نہ کہ مریم زمانی۔ قیاس بھی کہتا ہے کہ جب اکبر اپنی ماں کو مریم مکانی پکارتا تھا، تو اپنی بیوی کو مریم زمانی کا لقب دے کر اس کا ہمسر کیوں بناتا؟ یہ شیوۂ ادب کے بالکل خلاف تھا۔

سلیمہ سلطان بیگم کا جو کچھ حال مجھے اس وقت یاد ہے، لکھتا ہوں۔ یہ ہمایوں کی بہن گل رُخ بیگم کی لڑکی تھی۔ ہمایوں نے اپنی زندگی میں اسے بیرم خاں سے منسوب کر دیا تھا۔ جب شادی ہوئی تو پانچ برس کی عمر تھی۔ بیرم خان کی شہادت کے بعد اکبر نے خود عقد کر لیا کہ غالباً اس وقت بالغ ہوئی ہو گی۔ تمام تاریخیں متفق اللفظ ہیں کہ علم و فضل، عقل و دانش، قوتِ تحریر و تقریر، فصاحت و خوش بیانی میں یہ بیگم اپنا نظیر نہیں رکھتی تھی اور بڑے بڑے فاضل مردوں کے سر اس کے آگے جھکے رہتے تھے۔ مہماتِ سلطنت میں بھی اس کو بڑا دخل تھا۔ مجھ کو یاد ہے کہ جب شہزادہ سلیم (جہانگیر) نے بغاوت کی ہے اور الہ آباد اپنے نام کا خطبہ و سکہ شروع کر دیا ہے، تو اکبر بہت ہی پریشان ہوا۔ مریم

مکانی کی کوششیں بھی جہانگیر کو راہ راست پر نہ لا سکیں۔ ابو الفضل کو اسی لیے دکن سے بلایا مگر جہانگیر نے راہ میں قتل کرا دیا۔ مجبور ہو کر سلطان سلیمہ بیگم کو بھیجا کہ اپنی عقل و تدبیر اور خوش بیانی و سحر آفرینی سے جہانگیر کو قابو میں لائے۔ چنانچہ خافی خاں نے جہاں یہ واقعہ لکھا ہے، وہاں لکھا ہے کہ خدیجۃ الزمانی سلطان سلیمہ بیگم کو اکبر نے روانہ کیا۔ بیگم گئیں اور اس خوبی سے سمجھایا بجھایا کہ جہانگیر قابو میں آگیا اور بیگم کے ہمراہ حضور شاہی میں حاضر ہونے کے لیے روانہ ہوا۔ آگرہ کے قریب آکر عرضی بھیجی کہ مجھ کو لینے کے لیے مریم مکانی آئیں۔ چنانچہ وہ گئیں اور بادشاہ کے حضور میں اس طرح پیش ہوا کہ ایک ہاتھ مریم مکانی پکڑے ہوئے تھیں اور ایک سلطان سلیمہ بیگم۔ اکبر محبت کا پتلا تھا اور عفو و بخشش کا خداوند، بے اختیار گلے سے لگالیا اور آنسوؤں نے بہہ کر دلوں کی کدورتوں کو صاف کر دیا۔

یہ واقعات تمام تاریخوں میں مندرج ہیں۔ ملا عبد القادر بدایونی نے بحکم اکبری سنسکرت سے "سنگھاسن بتیسی" کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا اور اس کا نام "نامۂ خرد افزا" رکھا تھا۔ اتفاق یہ کہ اس کا سرکاری نسخہ شاہی کتب خانے سے گم ہو گیا۔ ملا صاحب نے "منتخب التواریخ" میں لکھا ہے کہ جس زمانے میں نسخہ گم ہوا، اسی زمانے میں خدیجۃ الزمانی سلطان سلیمہ بیگم نے بادشاہ سے فرمائش کی کہ "نامۂ خرد افزا" میں دیکھوں گی، نکلوا دو۔ جب کتب خانے میں نہیں ملا تو میری تلاش ہوئی کہ اصل مسودہ حاصل کیا جائے۔ میں رخصت پر وطن میں تھا۔ بیمار ہو گیا تھا۔ اس لیے مدتِ مقررہ سے پانچ مہینے زیادہ ہو گئے۔ جب بار بار کی شاہی طلبی پر بھی حاضر نہ ہو سکا اور "نامۂ خرد افزا" کے لیے بیگم کا اصرار بڑھتا گیا تو حکم ہوا کہ گرفتار کر کے حاضر کرو۔ ناچار افتاں و خیزاں پہنچا۔ شیخ فیضی دکن میں تھے۔ اُنھوں نے سفارشی عریضہ لکھ کر بھیجا اور بہزار مشکل مخلصی ہوئی۔

سلطان سلیمہ بیگم شعر بھی نہایت خوب کہتی تھیں اور اعلیٰ ذوق کی نقاد تھیں۔ خواتین تیموریہ کی یہ عام خصوصیت تھی۔ ایک شعر مجھے نہیں بھولتا کہ والہ داغستانی نے اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے اور برسوں سے یاد ہے۔

کاکلت را من زمستی رشتۂ جاں گفتہ ام   مست بودم زیں سبب حرفِ پریشاں گفتہ ام

ملا صاحب ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گلبدن بیگم مصنفۂ "ہمایوں نامہ" کے ہمراہ حج کو گئیں اور چار سال تک مکہ معظمہ میں رہ کر چار حج کیے۔ واپسی میں جہاز کو طوفان نے گھیرا۔ سال بھر تک عدن میں توقف ہوا۔ جہانگیر کے آخر عہد تک زندہ تھیں اور بلا شبہ "تزک" میں جہانگیر نے تین چار جگہ ان کا ذکر کیا ہے۔ مجھے یاد ہے مگر حوالہ نہیں دے سکتا کہ "تزک" اس وقت موجود نہیں۔

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ سلطان سلیمہ بیگم کا لقب خدیجۃ الزمانی نہیں بلکہ مریم زمانی تھا، جب بھی فادر ہوسٹن کو اپنی تر کتاز تحقیق میں اتنا بے رحم نہیں ہونا چاہیے کہ خواہ مخواہ ہمایوں کی بھانجی کو جس کا باپ خواجگان کاشغر میں سے تھا، ایک ارمنی عیسائی بنا دیں جو اکبر کے محل میں لیڈی ڈاکٹر بن کر آئی اور اس کے بعد حرم میں داخل کر لی گئی۔

مسٹر ایم۔ اے۔ ایف لکھتے ہیں کہ "اس ضمن میں ایک حکایت بھی سننے میں آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ مریم کی ایک بہن بھی تھی جس کا نام جولیانا تھا۔ حرم شاہی میں یہ بطور لیڈی ڈاکٹر کے کام کرتی تھیں۔ مریم کی شادی اکبر سے ہوئی اور جولیانا شہزادہ بوربون سے بیاہی گئی۔"

میں مسٹر موصوف کا یہاں تک ساتھ دینے کے لیے موجود ہوں کہ موجودہ زمانے میں ایک نوجوان لیڈی ڈاکٹر، ایک نوخیز معلمہ، ایک نوعمر نرس یا دفتر کی ایک کم سن ٹائپ رائٹرس کے لیے آخری خبر یہی سننے میں آنی چاہیے کہ آفس سے گھر میں داخل ہو گئی۔

کرم نما و فرود آ، کہ خانہ خانۂ تست

تاہم کچھ ضرور نہیں کہ سولھویں صدی میں اکبر کے محل میں بھی ایسا ہی ہوتا ہو اور بیسویں صدی کی لیڈی ڈاکٹر

خوش طبیب ست بیا تا ہمہ بیمار شویم

کے منازلِ حیات پر قیاس کر کے سولھویں صدی میں ایک ارمنی لیڈی ڈاکٹر کی تلاش بالکل بے سود ہے۔

اب ایک اور تازہ مصیبت کی خبر سُنیئے۔ اب تک تو صرف مس میری میکانی ہی ستم ڈھا رہی تھیں، اب ان کی بہن بھی تشریف لے آئیں۔

یک من و بر سر قتل اند پریزادے چند

یہاں میری میکانی ہی کے ہاتھوں جان عذاب میں تھی، اب دیکھیے مس جولیاتا کی عشوہ طرازیاں کیا قہر ڈھاتی ہیں۔

ہونے دیتا نہیں یاں عہدہ برا ایک ہی شخص

ان کے پیچھے پیچھے عجیب وغریب شہزادہ بوربون بھی نازل ہو گئے۔ یہ کون حضرت ہیں اور کہاں کے رہنے والے ہیں؟ چینی یا افریقی؟ اب تک تو دُنیا کو یہی معلوم تھا کہ اکبر کے تین شہزادے تھے۔ سلیم، مراد، دانیال۔ اب یہ چوتھے بوربون بھی نکل آئے۔ یہ غالباً دوسرا انکشاف ہے۔

ان تمام دلائل سے بھی بڑھ کر مسٹر ایم۔اے۔ایف کی وہ دلیل ہے، جہاں آکر وہ ایک راوی و ناقل کی جگہ ایک مؤرخ مجتہد کی حیثیت اختیار فرماتے ہیں اور آپ کی ذاتی تحقیقات کا قیمتی ذخیرہ بٹنا شروع ہوتا ہے۔

زیں گنج بہ مفلساں خبر کن

چنانچہ لکھتے ہیں: "آئینِ اکبری سے جن بیگمات کے نام اوپر درج کیے گئے ان میں نمبر چار پر عبدالوصی کی حسین بیوی کا ذکر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اصل نام عبدالمسیح ہوگا جو بگڑ کے وصی ہو گیا اور عبدالوصی کی حسین بیوی مریم کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔"

سبحان اللہ! پہلے تو مریم مکانی سے سلسلہ شروع ہوا، پھر مریم زمانی کی باری آئی۔ اب غریب عبدالوصی کو عبدالمسیح بنایا جا رہا ہے۔ وہ مسکین ہر چند روتا ہے کہ میرا نام عبدالوصی ہے۔ مگر آپ کہتے ہیں کہ "میرا خیال ہے" نے فتویٰ صادر کر دیا۔ اب چھٹکارا ممکن نہیں۔ اگر ہمارے مؤرخ دوست اپنی مسیحی ملکہ کے انکشاف کی قربان گاہ پر اسی طرح

زبردستی لوگوں کی قربانیاں چڑھاتے رہیں گے تو مجھ کو خوف ہے کہ عہد اکبری کا ایک شخص بھی اس مؤرخانہ مارشل لا سے نہ بچ سکے گا۔ اگر تاریخی تحقیقات کا دارومدار اسی "میرا خیال ہے" کے زریں اصول پر قرار دے دیا گیا تو قریب ہے کہ فن تاریخ کو از سر نو مرتب کرنا پڑے اور میں ابھی سے پیشین گوئی کرتا ہوں کہ اس خدمت کے لیے مسٹر موصوف سے بہتر آدمی نہیں ملے گا۔ لطف یہ ہے کہ کس عجلت کے ساتھ آپ نے عبدالوصی کو عبدالمسیح بنا کے ساتھ ہی اس کا بھی فیصلہ کر دیا کہ جب وہ عبدالمسیح ہے تو یقیناً اس بدبخت کی بیوی مریم ہوگی۔ اگر اور کوئی ہاتھ نہیں آتا تو اسی کو پکڑ دو "ایں ہم بچہ شتر است"۔ ع

ادھر لا ہاتھ، مٹھی کھول، یہ چوری یہیں نکلی

اگرچہ مسٹر موصوف کی یہ قیمتی تحقیق اس سے بہت اشرف و اعلیٰ ہے کہ جواب دینے کی گستاخی کی جائے، تاہم قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے بطور ایک لطیفے کے اس کی کچھ تشریح کرنی چاہیے۔ ہمارے نئے مؤرخ کو یہ معلوم نہیں کہ "وصی" عربی کا بامعنی جملہ ہے اور اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کسی دوسرے سے بگڑا ہو، گو بیسویں صدی کے یورپین محقق کی تاریخی تحقیقات کی تکمیل کے لیے اس کا بگڑ نا کتنا ہی ضروری ہو۔ اصلاً یہ نام ایرانی ہے اور ہزارہا مسلمانوں کی فہرست پیش کی جا سکتی ہے، جن کا نام اب بھی عبدالوصی ہوگا۔ مسلمانوں کے ایک فرقے کا اعتقاد ہے کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت امیر علیہ السلام کو اپنے بعد اپنا جانشین قرار دیا تھا اور وصیت کی تھی کہ آپ ہی خلیفہ ہوں۔ اس بنا پر حضرت امیر کا لقب وصی قرار پایا یعنی وصی پیغمبر۔ اسی طرف منسوب کر کے عبدالوصی نام رکھا جانے لگا۔ عبدالوصی کے علاوہ محمد وصی، وصی احمد، غلام وصی وغیرہ نام بھی عموماً رکھے جاتے ہیں اور اب ایرانیوں اور شیعوں کی خصوصیت نہیں رہی، ہندوستان میں عام طور پر رائج ہیں۔ اور یہ اس قدر معمولی بات ہے جو ہر اس انگریز کو معلوم ہونی چاہیے جو مسلمانوں سے ملتا جلتا ہو۔ خود میرے دوستوں میں ایک عالم و فاضل بزرگ شیخ عبدالوصی طیبی ہیں جو آج کل

طہران میں ہیں۔

مسٹر موصوف کو اس کی تو خبر نہیں۔ اُنھوں نے انگریزی میں وصی کو ڈبلیو اور ڈبل ایس سے لکھا دیکھا، سمجھ لیا کہ ڈبلیو ایم کی معکوسی شکل ہے۔ اصل میں ایم ہوگا اور جھٹ قیاس کرلیا کہ یہ اصل میں مسیح ہے۔ مزید برآں یہ کہ دونوں کی آواز ملتی جلتی ہے۔ لیکن اگر اشتراکِ صوت کی بنا پر اسی طرح ناموں کو مسخ کیا جائے گا تو پھر تاریخ سے امن اُٹھ گیا اور اس ذہنی انارکی میں دُنیا کا کوئی انسان بھی پامالی سے نہ بچ سکے گا۔

"میرا خیال" یہ ہے کہ فادر ہوسٹن کا اصلی نام ہوسٹن نہیں بلکہ حسین ہے اور وہ دراصل مسلمان ہیں۔ غلطی سے ٹی بڑھ گیا۔ لوگوں نے ہوسٹن کہنا شروع کردیا۔ مسٹر ایم۔ اے۔ ایف کا اس انکشاف کے متعلق کیا خیال ہے۔

اصل یہ ہے کہ یہ سارا دردِ سر اس لیے ہے کہ کسی نہ کسی طرح اکبرِ اعظم کی بے تعصبیوں اور علم پروریوں کے لیے ایک مسیحی سرچشمہ پیدا کیا جائے۔ ایشیا میں جب کبھی کسی کمال اور خوبی کا ظہور ہوتا ہے تو یورپین محققوں کو عموماً یہ زحمت گوارا کرنی پڑتی ہے۔ تاج محل آگرہ بہترین عمارت ہے، اس لیے اس کے معماروں میں کوئی نہ کوئی اٹالین ضرور ہوگا۔ عثمان پاشا نے پلیونا میں جب عالم افگن دفاع کیا تو یورپ کے ماہرین علم الاقوام کا فیصلہ ہوا کہ یہ ضرور عیسائی نسل سے ہے۔ ایک نامہ نگار نے تو بے دھڑک دعویٰ کردیا کہ آسٹرین ہے۔ او ہم پاشا نے جب تھسلی کو عدیم النظیر شجاعت و کامرانی کے ساتھ فتح کیا تو یورپ کے اخبارات نے لکھا کہ اگر یہ نہیں تو اس کا خاندان ضرور یورپین ہوگا۔ یہی مصیبت اب اکبر کے سر بھی آئی ہے۔ وہ خود عیسائی نہیں تو عیسائی لیڈی کا شوہر ہی سہی۔

(۳)

اکبر نے اپنے عہد میں باوجود بڑی بڑی مہموں کے ملک کا نہایت معقول انتظام کیا تھا۔ بھلا یہ حسنِ تدبیر ایشیا کی مٹی سے کب پیدا ہوسکتی ہے؟ ضرور کوئی عیسائی مشیر ہوگا۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس کے لیے کوئی سہارا نہیں ملتا۔ اب واجب ہوا کہ دربار کو چھوڑ کر محل سرا کی سراغ رسانی کی جائے۔ یہاں آکر سنا کہ ایک ملکہ مریم مکانی ہے اور ایک شخص

کا نام عبدالوصی تھا۔ پس کاروانِ تحقیق کے لیے یہی مقام منزلِ مقصود ٹھہرا اور ثابت ہو گیا کہ عبدالوصی، عبدالمسیح تھے اور مریم دراصل ایک ارمنی لیڈی ڈاکٹر یا اس کی دلربا بہن تھی۔ اکبر کے عہد میں جو کچھ ہوا وہ اسی فتنہ گیر ارمنی کی کارفرمائیاں تھیں۔ فخر و فضیلت اس میں جو کچھ ہے، مسیحیت کے لیے ہے، ہندوستان کو اس پر ناز کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

اگر ہمارے نئے محقق کا اس تمام افسانہ طرازی سے یہی مقصود ہے تو خدا رافن تاریخ پر رحم فرمائیں۔ ہم یوں بھی مان لینے کے لیے تیار ہیں۔ اگر تاریخی سہارے ہی کی ضرورت ہے تو تاریخ ہند پر اس قدر مصیبت لاتا کیا ضرور ہے؟

"اکبر نامہ" سے یہ تو ثابت ہی ہے کہ بندر سورت اور گوا سے مسیحی پادری (کیتھولک فادرز) دربارِ اکبری میں آئے تھے اور اکبر نے اپنے لڑکے دانیال کو ان کی شاگردی میں دیا تھا کہ یونانی زبان پڑھے۔ روم و یونان کی تاریخ بھی ان کی مدد سے فارسی میں ترجمہ کرائی گئی تھی، ......، جو "ثمرۃ الفلاسفہ" کے نام سے اب تک موجود ہے۔ اتنا تعلق اس کے لیے بس کرتا ہے کہ عہد اکبری کی ساری فضیلتیں مسیحی پیشواؤں کے سپرد کر دی جائیں۔

ہمارے فادر ہوسٹن (جو غالباً خود بھی کیتھولک ہیں اور جیسویٹ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں) اپنے پیشروؤں کو کیوں بھول گئے؟ کیوں نہ ارشاد ہو کہ عہدِ اکبری میں جو کچھ ہوا وہ انہی مقدس حضرات کے قدوم میمنت لزوم کی برکت ہے۔ اگرچہ ان کے شاگرد دانیال کو تین چار دن کی برائے نام شاگردی بھی راست نہ آئی اور تین سال بعد ہی مر گیا۔ ع

قصد کعبے کا نہ کیجیے گا بایں یمن قدوم

بہرحال کہاں تک وقت ضائع کیا جائے۔ یہ پوری کہانی یکسر لغو ہے اور جتنی بنیادیں رکھی گئی ہیں، یکے بعد دیگرے ایک سے ایک بڑھ کر تمسخر انگیز ہے۔ کہیں عجیب الخلقت بوربون تشریف رکھتے ہیں، کہیں عبدالوصی کو زبردستی بپتسما دیا جا رہا ہے۔ کہیں میری اور جولیانا اپنے ناز و عشوہ کی بارود سے محل اکبری میں سرنگ لگا رہی ہیں۔ کہیں میری میکانا کو آگرہ میں دفن کیا جا رہا ہے۔ تاریخ کی بنیاد شہادت پر ہے نہ کہ توہمات اور تخیلات پر۔ اس سلسلے میں حسب ذیل امور پیش نظر رہیں:

(۱) اس دعوے کی تمام تر بنیاد اس پر ہے کہ اکبر کی ایک بیوی کا نام مریم تھا۔ مسٹر ایم ای۔ ایف نے جو کچھ لکھا ہے، سب اسی بنا پر ہے اور فادر ہوسٹن کی ترکتاز تحقیق کا بھی سب سے بڑا اسٹیل یہی ہے، لیکن سرے سے اسی کا ثبوت نہیں۔ اکبر کی کسی بیوی کا نام مریم نہ تھا۔

(۲) اکبران خوش نصیب فرماں رواؤں میں تھا جس کے عہد کا کوئی گوشہ تاریخ کی روشنی سے محروم نہیں۔ اس کی پوری زندگی مورخینِ عہد کی بدولت ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ اکبر کی ولادت کی تاریخ ہے:

شب یک و پنج رجب است

اس مصرعے کے عدد ۹۵۰ھ ہیں۔ انتقال کی تاریخ آصف خاں نے کہی:

الف کشیدہ ملائک ز فوت اکبر شاہ

الف کشیدہ یعنی ایک کے تخرجہ کے بعد ۱۰۱۴ھ۔ اس حساب سے ۶۴ برس کی عمر ہوئی اور ۵۱ برس حکومت کی۔ ۵۱ برس میں سے ۴۶ برس تک کا حال ابوالفضل نے اس طرح لکھا ہے گویا ایک مرتب روزنامچہ ہے۔ باقی پانچ برس کا حال عنایت اللہ نے لکھ کر الگ تتمہ بنایا[۲۳]۔ اسی طرح ملا عبدالقادر بدایونی نے ۱۰۰۴ھ تک کے حالات حرف بہ حرف بہ ترتیب سنین لکھے ہیں اور نظام الدین احمد بخشی نے بھی "طبقات اکبری" میں ۱۰۰۲ھ تک کے واقعات قلم بند کیے ہیں۔ ان کے بعد عہد جہانگیری میں "تاریخ فرشتہ" لکھی گئی اور اس کے بعد خافی خاں نے محمد شاہ تک آلِ تیمور کی مکمل تاریخ لکھی۔

یہ تمام مواد، تاریخ تیموری کا اصل مواد ہے اور تمام تاریخی شہادتوں کا دار و مدار اسی پر ہونا چاہیے۔ مگر ان تمام تاریخوں میں کہیں اس کا اشارہ تک نہیں پایا جاتا کہ اکبر کے محل میں کوئی مسیحی عورت مریم نامی تھی۔ بادشاہ کے محل کا معاملہ اس کی زندگی کے اہم وقائع میں سے تھا۔ ابوالفضل نے ایک ایک رانی اور ملکہ کے تفصیلی حالات دیے ہیں۔ ممکن نہ تھا کہ ایک ملکہ کی پوری سرگذشت چھوڑ دی جائے۔

(۳) اگر کہا جائے کہ یہ واقعہ ناموزوں تھا کہ ایک عیسائی عورت کو محل میں داخل کیا، اس

لیے خوشامد سے مورخین نے چھپایا تو اوّل تو یہی غلط ہے کہ واقعہ ناموزوں تھا، اہل کتاب سے عقد کرنا کوئی ناموزوں بات نہیں۔ ثانیاً جب ہندو رانیوں کے واقعات فخر و مسرت سے رتّی رتّی جمع کیے گئے تو اس واقعہ کو کیوں چھپایا جاتا ؟

(۴) سب سے بڑھ کر یہ کہ اکبر کے طبقۂ مورخین میں ایک پوشیدہ قلم ایسا تھا جو چپکے چپکے کام کر رہا تھا اور اس نے اکبر کے ایک ایک عیب کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کیا ہے۔ یہ ملا عبد القادر بدایونی تھے، جن کو اکبر اور دربارِ اکبری کی ایک ایک بات پر تمسخر اڑانے میں مزہ ملتا تھا۔ جہاں کہیں موقع نشتر چبھونے کا ملتا ہے، خواہ اکبر کی گردن ہو یا ابوالفضل کا جگر، کبھی نہیں چوکتے اور ہر ایسی بات کو چمکا کر لکھتے ہیں، جس سے اکبر کی بے دینی اور غیر مذاہب کی طرف میلان ثابت ہو۔ اگر فی الحقیقت اس کہانی کی کوئی اصلیت ہوتی تو وہ بغیر خاک اڑائے کب رہ سکتے تھے؟ وہ تو اتنی بات پر ہی بگڑے بیٹھے ہیں کہ پادریوں کو سورت سے بلایا اور بائبل کے ترجمے کا حکم دیا۔ گو ترجمہ نہ ہوا۔

مسٹر ایم۔ ای۔ ایف نے اور جس قدر کہانیاں لکھی ہیں، سب کی سب بے کار اور ناقابلِ توجہ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جو پادری اکبر کے یہاں آئے تھے، انھوں نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کہاں کہا ہے اور کس کتاب میں؟ پھر ان کا قول مقبول ہوگا یا ابوالفضل اور بخشی کا؟ وہ لکھتے ہیں کہ میں نے شاہ عالم ثانی کا ایک فرمان دیکھا ہے، جس میں لکھا ہے کہ اکبر کی عیسائی بیوی کی سفارش سے پادریوں کی پنشن مقرر کی گئی۔ سوال یہ ہے کہ وہ فرمان کہاں ہے اور اس کی اصل عبارت کیا ہے؟ یہ تاریخ کا مسئلہ ہے، بازاری گپیں اور کہانیاں یہاں سنانا بیکار ہے۔

حواشی

1- Reminiscences of Agra, 1894

2- The Tale of the Tulsi Plant, 1908

۳۔ ان کاغذات میں ہوسٹن کے غیر مطبوعہ مسودات، مطبوعہ مضامین کے مبیضے، مکتوبات، پرانی کتابوں سے منقول عبارات اور مختلف اخبارات و جرائد کے تراشے پڑے ہوئے ہیں۔ ہوسٹن کا یہ نجی ذخیرہ عہدِ مغلیہ میں مسیحی آثار کا بیش بہا خزینہ ہے اور اس سے اس دور کے کئی مخفی گوشے سامنے آتے ہیں۔ یہ کاغذات ہوسٹن کی وفات کے بعد برسوں ایک دُور افتادہ مقام Kurseong میں پڑے رہے، جہاں سے انہیں ۱۹۷۲ء میں دہلی میں واقع ودیا جیوتی لائبریری میں منتقل کر دیا گیا۔

۴۔ مثلاً "انگلش مین" (۱۶، ۲۲ ستمبر۔ ۲۰ اکتوبر۔ ۴، ۱۵، ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء)۔ "دی سٹیٹس مین" کلکتہ (۱۶، ۲۰، ۲۴، ۳۰ ستمبر۔ ۱ اکتوبر ۱۹۱۶ء)۔ "دی انڈین ڈیلی نیوز" (۲۲ ستمبر ۱۹۱۶ء)۔ "کیتھولک ہیرالڈ" کلکتہ (۲۳ اگست، ۲۷ ستمبر ۱۹۱۶ء)۔ "بنگال پاسٹ اینڈ پریذنٹ" کلکتہ (جلد ۲۴، ۱۹۲۷ء، ص ۹۷-۱۰۵)۔

ہوسٹن کے علاوہ اس موضوع پر یسوعی مورخ ہنری ہیرس (۱۸۸۸-۱۹۵۵ء) اور F.S.Scallan نے مقالات لکھے، جو بالترتیب "جرنل آف انڈین ہسٹری (۱۹۲۴ء، ص ۲۸۱-۲۳۵) اور "سٹیٹس مین" (جو ۱۵ جولائی ۱۹۲۷ء، ص ۶، ۱۳) میں طبع ہوئے۔

۵۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

S.K. Banerji: Mariam Ki-Kothi or Sunahra makan of Fatehpur Sikri (Journal of the United Provinces Historical Society 17/i, 1944, pp. 103-110).

ے The Jesuits and the Great Mogul London, 1932, pp.157-161.

ے ہوسٹن نے زیرِ بحث موضوع سے خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا اور اسے تاریخی حقیقت کا درجہ دینے کے لیے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ نیز وہ ایسا مؤرخ ہے جس نے تمام عمر دورِ مغلیہ میں مسیحیت کی تبلیغ، ترویج اور اس کے تاریخی مصادر پر قابلِ قدر تحقیقی کام کیا ہے۔ اس لیے مناسب ہوگا اگر یہاں اس کے سوانح حیات مختصراً بیان کر دیے جائیں۔ اُس کے حالاتِ زندگی مختلف سوانحی کتب وغیرہ میں موجود نہیں۔ میکلیگن نے اپنی محولہ بالا کتاب میں اس کی تالیفات اور مقالات کی فہرست دی ہے (ص ۳۹۱ - ۳۹۴) لیکن سوانح نہیں دیے۔ راقم کو صرف ایک ہی ایسی کتاب دستیاب ہوئی ہے، جو اس کی وفات سے ایک سال بعد یعنی ۱۹۳۶ء میں کلکتے سے طبع ہوئی تھی اور اس کے شروع میں یسوعی مرتب F. Eflen نے ہوسٹن کے تصنیفی کارناموں کے ساتھ اس کے حالاتِ زندگی بھی تحریر کیے ہیں۔ کتاب کا عنوان درج ذیل ہے:

Antiquities from San Thome and Mylapore. The tradifional site of the Mastyrdom and tomb of St. Thomas as the Apostle. Compiled by Rev. H. Hosten.

اس کتاب کے مرتب کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق ہنری ہوسٹن فلانڈرز (بلجیئم) کے ایک مقام Ramskapelle پر ۲۶ مارچ ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوا۔ ۲۳ ستمبر ۱۸۹۱ء میں وہ یسوعی فرقے میں شامل ہوا۔ دو سال بعد کینڈی (سری لنکا) میں نئی تعمیر کردہ عبادت گاہ میں بلا لیا گیا، جہاں وہ چھ سال تک لاطینی اور انگریزی زبانیں پڑھاتا رہا۔ ۱۹۰۰ء میں اُس نے فلسفہ پڑھنا شروع کیا اور تین سالہ کورس ختم کرنے کے بعد اسے دارجلنگ بلا لیا گیا۔ اگلے سال وہ Kurseong مذہبی تعلیم کے تین سالہ کورس کے لیے چلا گیا۔ یہیں اس نے معروف انڈین اکیڈمی کا سنگ بنیاد رکھا۔ ہوسٹن اس اکیڈمی کا سیکرٹری اور کتاب دار مقرر ہوا، اور یہیں سے اس کی تاریخی تحقیقات کا آغاز ہوا۔ ۱۹۰۹ء میں وہ سینٹ زاویئر کالج (کلکتہ) میں پروفیسر ہو گیا۔ ۱۹۲۶ء تک وہ اسی حیثیت سے

کام کرتا رہا۔ صحت کی مسلسل خرابی کے باعث وہ یورپ چلا گیا اور بالآخر ۱۶ اپریل ۱۹۳۵ء کو اس کا انتقال ہوگیا۔

ﮧ ۸ ۲۳ مارچ ۱۹۱۶ء کو حکومتِ بنگال نے مولانا سے ایک حکم امتناعی کی تعمیل کرائی کہ وہ ایک ہفتے کے اندر اندر بنگال کی حدود سے نکل جائیں۔ چنانچہ وہ ۳۰ مارچ کو رانچی چلے گئے اور یہیں حکومت نے انہیں نظر بند کر دیا۔ وہ اس سے قریب مورابادی نامی ایک گاؤں میں رہائش پذیر تھے۔ چار سال تک مولانا اسی جگہ نظر بند رہے اور پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر جنوری ۱۹۲۰ء کو رہا ہوئے۔

ﮧ ۹ جلد ۲۲، نمبر ۴۳، بابت ۴ ستمبر ۱۹۱۶ء۔ جلد ۲۲ نمبر ۴۴، بابت ۹ ستمبر ۱۹۱۶ء۔ جلد ۲۲ نمبر ۴۵، بابت ۱۳ ستمبر ۱۹۱۶ء۔ یہ اخبار ہفتے میں دو بار نکلتا تھا۔

ﮧ ۱۰ "وکیل" کے ایک شمارے (بابت ۶ ستمبر ۱۹۱۶ء) میں شائع ہونے والے ایک مراسلے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کے کسی شمارے میں شمس العلما مفتی محمد عبداللہ ٹونکی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے مسئلہ فسخ نکاح پر مقالات چھپوائے تھے۔

ﮧ ۱۱ ۱۹۱۶ء میں "وکیل" کے سرورق پر یہ عبارت شائع کی جاتی تھی۔ "مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا محافظ، ان کی اخلاقی اور اجتماعی زندگی کا مصلح، اُن کی تعلیم کا حامی، ان کے قومی کاموں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنے والا، ان میں قومیت اور یگانگت کی زندگی پیدا کرنے والا"۔ جب اس کا اجرا ہوا (غالباً ۱۸۹۵ء) تو یہ ہفت روزہ تھا۔ یکم اپریل ۱۹۰۱ء سے یہ ہفتے میں دو بار شائع ہونے لگا۔

ﮧ ۱۲ St. Xavier College (Calcutta)

ﮧ ۱۳ Fr. Hosten (۱۸۷۳-۱۹۳۵ء)

ﮧ ۱۴ Asiatic Society of Bengal (Calcutta)

۱۵ے فادر ہوسٹن کا یہ تفصیلی مضمون ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے Memoris میں شائع ہوا اور اس کا ایک حصہ اکبر کی مسیحی بیوی سے متعلق ہے (دیکھیے، جلد پنجم، ۱۹۱۶ء، ص ۱۷۵ - ۱۷۷)

۱۶ے ڈاکٹر الوئس اشپرینگر (Dr. Aloys Sprenger) ۱۸۱۳ تا ۱۸۹۳ء - انیسویں صدی کا معروف آسٹرین مستشرق جو تقریباً چودہ برس ہندوستان میں رہا، اور یہاں ہگلی کالج اور مدرسہ عالیہ کلکتہ کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرتا رہا -

۱۷ے "آئین اکبری" کا مکمل انگریزی ترجمہ تین جلدوں میں شائع ہوا - مترجمین ہنری بلوخمن اور جیرٹ، کلکتہ ۱۸۶۸ - ۱۸۹۴ء "تزک جہانگیری" کا انگریزی ترجمہ واجرنے کیا اور اسے بیورج نے ترتیب دے کر دو جلدوں میں طبع کرایا (لندن ۱۹۰۹ - ۱۹۱۴ء) - انگریزی کے علاوہ ان دونوں کتابوں کا ابھی تک کوئی کامل یا جزوی فرانسیسی ترجمہ شائع نہیں ہوا - (بحوالہ سٹوری: پرشین لٹریچر، جلد اوّل، حصہ اوّل، طبع عکسی، لندن ۱۹۷۱، ص ۵۵۰ - ۵۵۱)

۱۸ے شاید اس سے مراد وہ ایڈیشن ہے، جو کلکتہ سے ۱۸۷۳ اور ۱۸۸۷ء کے درمیان شائع ہوا تھا اور اس کے مرتبین آغا احمد علی اور عبدالرّحیم تھے -

۱۹ے اس سوسائٹی کی جانب سے ان تاریخوں کے خلاصے تو نہیں البتہ اُن کے مکمل متون اور انگریزی تراجم ضرور شائع ہوئے تھے - "طبقات اکبری" کی پہلی جلد ۱۹۱۳ء میں طبع ہوئی تھی - باقی دو جلدیں ۱۹۲۷ء اور ۱۹۳۱ء میں چھپی تھیں - بدایونی کی "منتخب التواریخ" ۱۸۶۴ء اور ۱۸۶۹ء کے مابین شائع ہو چکی تھی - "تاریخ فرشتہ" کا ملخص انگریزی ترجمہ (متن نہیں) یہیں سے طبع ہوا تھا (۱۹۰۸ - ۱۹۱۰) - اس سوسائٹی سے جرنل بھی نکلتا تھا، لیکن ایسے متون اور تراجم اس میں شائع نہیں کیے جاتے تھے -

۲۰ے ایلیٹ (Elliot) کی منتخبات تاریخ سے مراد اس کی ضخیم "تاریخ ہند" ہے جو اس کی وفات کے بعد آٹھ جلدوں میں شائع ہوئی - "ہمایوں نامہ" کا متن مع انگریزی ترجمہ لندن سے ۱۹۰۲ء میں طبع ہوا - اسے بیورج نے مرتب کیا -

۲۱ے اس مؤرخ کی "منتخب اللباب" دو جلدوں میں کلکتہ ہی سے شائع ہوئی - ۱۸۶۰ - ۱۸۷۴ء

۲۲ھ "De Laet: India Vera, 1631,"

۲۳ھ یہ تکملہ "اکبرنامہ" کے کلکتہ ایڈیشن کے ساتھ ہی طبع ہوا۔ (جلد سوم ص ۸۰۲-۸۴۳)